R. No. 2186/57

Regd. No. L 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Date 1-8-65-22

Phone—29
Annual Rs. 4/-
per Copy-12

جلد ۲۶ - شمارہ ۴۷ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۱۵ دسمبر ۱۹۶۷ء

اداریہ

سرکاری زبان بل پر ہنگامے کیوں؟

ہندوستان بہت بڑا ملک ہے۔ اس کی آبادی پچاس کروڑ کے لگ بھگ ہوگی۔ اس میں چودہ بڑی اور ترقی یافتہ زبانیں اور بہت سی نسبتاً کم ترقی یافتہ زبانیں اور کئی سو بولیاں بولی جاتی ہیں۔ اس میں آب و ہوا، لباس، خوراک، رنگ، ناک نقشے کا خاصا فرق پایا جاتا ہے۔ پھر بھی سارے ہندوستانی ایک قوم ہیں اور ان کی ایک تہذیب ہے جو رنگا رنگ پہلو رکھنے کے باوجود ایک بنیادی وحدت رکھتی ہے۔ اس میں جو ریاستیں ہیں ان میں بہت سے معاملوں میں آزادی ہے، مگر سب مل کر ایک فیڈریشن یا مرکز کی پابند ہیں۔ دستور نے سب کو برابر کے حقوق دئے ہیں۔ کسی مذہب کو یا کسی زبان کو کوئی خاص امتیاز حاصل نہیں یہ دوسری بات ہے کہ سہولت کے لیے کسی ایک ہندوستانی زبان کو مرکز کے سرکاری کاموں کے لیے اختیار کر لیا جائے۔ اب تک انگریزی مرکز کی زبان تھی۔ اب اس کی جگہ ہندی حقیقی معنی میں اسی وقت لے سکے گی جب سارا ملک اس کے لیے آمادہ ہو۔ اگرچہ ہندی بولنے والوں کی تعداد دوسری کسی اور زبان کے بولنے والوں سے زیادہ ہے، مگر ہندی کو مرکز کی زبان تسلیم کرانے کے لیے دوسری زبانوں کے بولنے والوں کی حمایت حاصل کرنا ضروری ہے۔ ہمارا ملک ایک مشترک خاندان ہے۔ مشترک خاندان میں اسی وقت میل ملاپ اور یک جہتی رہ سکتی ہے جب بڑے چھوٹے سب ایک دوسرے کے جذبات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ بعد کوئی کسی پر زبردستی نہ کرے نہ کسی کو مجبور کرے نہ اس کو یہ احساس دلائے کہ وہ کمتر درجے کا ہے اور اس کے جذبات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ طاقت کی باتیں جبر کی طرف لے جاتی ہیں اور جبر کے خلاف ہمیشہ ایک مقابلے کی طاقت ابھر آتی ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ انگریزی دنیا کی ایک نہایت اہم زبان ہے اور نئے علوم خصوصاً سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے تعلیمی اداروں میں انگریزی کی تعلیم ضرور دی جائے، مگر اس کے معنی یہ نہ ہونے چاہئیں کہ انگریزی ہمارے سرکاری اور دفتری کاموں میں ابدالآباد تک استعمال ہوتی رہے اور ہندوستانی زبانوں کو ان کے حق سے محروم رکھا جائے۔ چنانچہ ہندوستانی زبانوں کو ترقی دینے اور انھیں جدید علوم سے مالا مال کرنے کی بڑے پیمانے پر کوشش کرنی چاہیے تاکہ وہ جلد یا بدیر اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بن سکیں مگر اس معاملے میں اگر غیر ضروری تاخیر بری ہوگی تو غیر معمولی عجلت بھی نامناسب ہوگی۔ اسے سیاسی جوڑ توڑ اور رسہ کشی کا مسئلہ نہیں بنانا چاہیے، بلکہ ماہرین لسانیات، استادوں، ماہرین تعلیم، عالموں اور ادیبوں کے اوپر چھوڑ دینا چاہیے۔ سیاست اتنی اہم چیز ہے کہ اسے محض ان سیاست دانوں پر نہیں چھوڑا جا سکتا جو صرف ووٹوں کے چکر میں رہتے ہیں اور صرف جذبات سے کھیلنا جانتے ہیں۔ حقیقی سیاست یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں اس شعبے کے ماہرین سے مدد لی جائے جو قومی نقطۂ نظر سے مسائل کو دیکھیں۔ اگر زبان کے متعلق یہ تصور عام ہوتا تو ہم اس مشکل میں نہ پڑتے جس میں آج گرفتار ہیں۔ چنانچہ سرکاری زبان بل جس کے ذریعہ سے ہندی کے ساتھ انگریزی کے استعمال کو بھی قانونی شکل دی جائے گی، آج ملک [illegible] ہو رہا ہے اور جس طرح انگریزی کے سائن بورڈ اور موٹروں کی پلیٹیں زبردستی مٹائی جا رہی ہیں اور توڑ پھوڑ کی جو کارروائی ہو رہی ہے، وہ ہندی کی کسی طرح خدمت نہیں ہے اور قومی سرمائے کی بربادی پر جو لوگ خوش ہو رہے ہیں وہ کسی طرح

محب قوم نہیں کہے جا سکتے۔ ظاہر ہے کہ انگریزی کے سائن بورڈ ایک ضرورت کو پورا کرتے ہیں جب وہ ضرورت ختم ہوجائے گی تو یہ بورڈ بھی نذر ہو جائیں گے مگر ان بورڈوں کو ہٹانے سے یا بسیں جلانے سے یا لوگوں پر پتھراؤ کرنے سے یا انگریزی نام کول تار سے مٹانے سے ہندی کی ترقی کیسے ہوجائے گی۔ جب ہندی میں ہماری مشترک تہذیب کے سارے عناصر کی جلوہ گری ہوگی، جب اس میں تمام علاقائی زبانوں سے الفاظ لیے جائیں گے، جب اس میں ہندوستانی کی روح اور مواد دونوں کا عکس ہوگا، جب اس میں سنسکرت کے علاوہ دوسری زبانوں کے الفاظ بھی جگہ پائیں گے اور جب اس میں چلن اور سب کی سہولت دونوں کا لحاظ ہوگا تو پھر ہندی کو سبھی زبانوں والے دل سے قبول کرلیں گے۔ پھر بھی ایک عالمی زبان کی حیثیت سے انگریزی کی ضرورت باقی رہے گی اور تاریخ نے ہمیں جو عالمی کھڑکی دی ہے اس سے نظر کی وسعت اور ذہن کی رفعت دونوں کا کام ہوں گے اس لیے ان ہنگاموں کو ختم ہونا چاہیے ان کی وجہ سے ملک کی خاصی بدنامی ہوئی ہے۔ مسائل بحث اور آپس میں بات چیت سے طے ہونے چاہئیں۔ ملک میں ہر حال میں امن رہنا چاہیے اور قومی یکجہتی اور باہمی اتفاق کو سب چیزوں پر مقدم رکھنا چاہیے۔

تحریر شمارہ ۳ و ۴ شایع ہوگیا

علمی مجلس دلی کا تماہی علمی و تحقیقی رسالہ تحریر کے دو شمارے ایک ساتھ شایع ہوئے ہیں۔ اس شمارے کے لکھنے والوں میں سید مسعود حسن رضوی، قاضی عبدالودود، گیان چند جین، ظہیر احمد صدیقی وغیرہ شامل ہیں۔

علی شیر نوائی کی ۵۲۵ سالہ جوبلی

تاشقند: علی شیر نوائی کی ۵۲۵ ویں سالگرہ ازبکستان میں آئندہ موسم بہار میں منائی جائے گی۔

اس عظیم شاعر سے متعلق اور اس کے کلام میں جن سورماؤں کا تذکرہ ہے ان کے متعلق کئی فلمیں تیار کی جارہی ہیں۔ اس جوبلی کے موقع پر تاشقند میں ایک ادبی میوزیم کا افتتاح عمل میں آئے گا۔ تاشقند میں نوائی کی یادگار قائم کی جائے گی۔ اس یادگار کا بہترین نمونہ حاصل کرنے کی غرض سے مقابلہ کا اعلان کیا گیا ہے۔ سمرقند میں بھی نوائی اور ان کے استاد عبدالرحمٰن جامی کی یادگار قائم کی جائے گی۔

نوائی کے کلام کے نئے ایڈیشن مرتب کیے جا رہے ہیں۔ کلام کی بارہ جلدیں ازبک زبان میں اور ۱۰ جلدیں روسی زبان میں شایع کی جائیں گی۔ یادگاری اشیاء کے طور پر قالین، غالیچے، کارچوبی کام کی ٹوپیاں، دوسری مختلف دھاتی اشیاء جن پر تصویریں ہوں گی اور زیورات وغیرہ بھی تیار کیے جارہے ہیں۔ جوبلی کے موقع پر دستیاب ہوں گے۔ جوبلی کے موقع پر تخلیقی کام کرنے والوں کی تمام یونینوں کے مشترکہ اجلاس منعقد ہوں گے۔ اس کے علاوہ ازبکستان کی سائنس اکاڈمی کا اجلاس بھی منعقد ہوگا۔ (قومی آواز)

یورپ اور امریکہ میں جشن غالب

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی سکریٹری بین الاقوامی جشن صد سالہ غالب کمیٹی ہالینڈ، انگلستان، فرانس، امریکہ اور کناڈا کے دورے کے بعد روس پہنچ گئے ہیں۔ تازہ ترین اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان ممالک میں غالب سے دلچسپی بڑھتی جاتی ہے۔

لائی ڈن (ہالینڈ) میں پروفیسر مرحسن اور ڈاکٹر ڈفرینہ نے طے کیا ہے کہ وہ اگلے تعلیمی سال سے غالبیات کا ایک نیا کورس لائی ڈن یونی ورسٹی میں شروع کریں گے جس میں تاریخ اور ادب کے سینیر طلبہ شرکت کریں گے۔ ہالینڈ میں غالب کی چند غزلوں کا ترجمہ بھی ہو رہا ہے وہ ڈچ ترجمہ پروفیسر مس بوزیر کر رہی ہیں جو دس سال ہندوستان میں رہ چکی ہیں، اور آج کل امریکہ کے گل فرڈ کالج میں مہمان پروفیسر ہیں۔ انگلستان میں پروفیسر فلپس، پروفیسر آربری (کیمبرج)، جناب رالف رسل (لندن)، جناب گرلن (اڈنبرا)، پروفیسر اسپیر (کیمبرج) اور جناب مسٹن لائبریرین انڈیا آفس وغیرہ پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی گئی ہے جو لندن میں ایک سیمینار یادگار نمائش سے دلچسپ اور غالب کی غزلوں پر مشتمل ایک موسیقی کا پروگرام ترتیب دے گی۔ اب انگلستان سے اردو کے تین اخبار نکلتے ہیں ہندوستانیوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچی ہے۔ ڈیڑھ سو کے قریب ہندوستانی ریسٹوران ہیں۔ اس لیے غالب کے لیے یہ ماحول کچھ ایسا اجنبی نہیں۔ جشن غالب کے سلسلے میں امریکہ میں ایک موثر کمیٹی بن گئی ہے جس میں پروفیسر نارمن براؤن، پروفیسر گرینیلا، پروفیسر عبدالرحمان بارکر اور دوسرے مشہور علمائے شرقیات شامل ہیں۔ چودھری محمد نعیم (وسکانسن) اس کے سکریٹری ہیں۔ اس کمیٹی کا ارادہ غالب پر مقالات کی کتابیات شایع کرنے اور ایک غالب شناس کو مہمان کی حیثیت سے امریکہ بلانے کا ہے۔ روس میں بھی غالب کمیٹی بن گئی ہے جس کے صدر اکیڈیمیشن پروفیسر غفوروف ہیں جو مستشرقین کی عالمی کانفرنس منعقدہ دہلی کے صدر رہ چکے ہیں۔ سکریٹری جناب گلبرو ہیں۔ کمیٹی میں پروفیسر چیلوشوف، پروفیسر دیاکوف، مرزا ترسون زادہ، مس زلفیہ خانم، صباحت عظیم جانووا، شاہ اسلام محمد یف، الکس سوخوچوف اور عبداللہ غفاروف وغیرہ تمام جمہوریتوں کے ذی علم ارکان شامل ہیں۔ یہاں کمیٹی نے جو پروگرام بنایا ہے اس میں ایک ندرت یہ ہے کہ روس، ازبک، تاجک، جارجین میں ترجموں، مقالوں، عام اور ادبی جلسوں کے علاوہ سمرقند میں جو غالب کے اجداد کا وطن ہے ایک یادگار رنسٹی ٹل بھی بنایا جائے گا۔ (ڈاکٹر نصیر احسن، شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی)

ڈاکٹر گیان چند

ڈاکٹر صفدر آہ اور مروّجہ عروض

۲۲ر اگست ۱۹۶۷ء کے "ہماری زبان" میں میرا ایک مضمون "سردار جعفری کی عروض اور مروّجہ عروض" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ ڈاکٹر صفدر آہ اس پر برہم ہیں اور ان کا عتاب نامہ "ڈاکٹر گیان چند اور رائج عروض" کے عنوان سے یکم رنومبر ۱۹۶۷ء کے "ہماری زبان" میں آیا ہے۔ آہ صاحب مضمون کے دوسرے حصے سے آزردہ ہیں۔ مضمون کی اشاعت کے فوراً بعد ایک نجی خط کے ذریعے مجھے اردو کے ایک بڑے عالم کا ردِّ عمل موصول ہوا۔ محترم استاذی ڈاکٹر اعجاز حسین سے کئی کئی برسوں کے وقفے سے مراسلت ہوتی ہے۔ اس بار انھوں نے از خود مجھے خط لکھا اور صرف میرے مضمون کے دوسرے حصے کی قدر افزائی کے لیے۔ ۲۵ر اگست ۶۷ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں:

"چنانچہ آپ کے اس مضمون کے پہلے حصے سے مجھے سر دست کوئی سروکار نہیں، ہاں دوسرا حصہ (۲) جس کو آپ نے کوئی عنوان نہیں دیا وہ سراسر میری دلچسپی کا ہے۔ آپ نے میرے دل کا کانٹا نکال دیا۔ بڑی معقول و نفسیاتی تجویز ہے۔ اردو کے فنِ عروض سے دلچسپی لینے والے کاش اس پر عمل کریں۔"

افسوس ڈاکٹر اعجاز صاحب کو یہ معلوم نہیں کہ ان کے دل سے جو کانٹا نکلا وہ ڈاکٹر صفدر آہ کے دل میں چبھ گیا۔ مجھے ڈاکٹر اعجاز حسین اور ڈاکٹر صفدر آہ میں انتخاب کرنا پڑے تو ظاہر ہے میں اعجاز صاحب کے پیچھے چلنا پسند کروں گا۔

ڈاکٹر آہ نے مجھ پر الزام لگایا ہے کہ میں نے مضمون بڑے غیر علمی انداز میں لکھا ہے لیکن اپنے جواب میں انھوں نے جو معیار قائم کیا ہے اس کے ہوتے ان کا اعتراض پھبتا نہیں۔ انھوں نے میرے بارے میں جو الفاظ استعمال کیے ہیں وہ اگر شروع میں نہیں تو آخر آخر بالکل اودھ پنچ کے رنگ میں رنگ گئے ہیں۔ میں اس انداز میں جواب نہیں دوں گا۔ الزام ہے کہ میں نے بجز اوروں کے شیخ علی حزیں اور میر پر پھبتیاں اور فقرے بازی سے کام لیا ہے۔ میں نے ان کے بارے میں جو معترضانہ جملے استعمال کیے تھے وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ شیخ علی حزیں نے اس میں مفعولن کی جگہ حسب منشا مفتعلن یا مستفعلن استعمال کر لیا۔

۲۔ اسی بحر میں میر ایک سببِ خفیف کی کمی کر جاتے ہیں جو بالکل نا روا ہے۔

۳۔ میر عروض میں کوئی گہری نظر نہ رکھتے تھے۔

۴۔ میر اس وزن کی رنگا رنگی سے واقف ہوتے تو جہاں کی کی کو گرانے کی ضرورت نہ سمجھتے۔

مجھے نظر نہیں آتا کہ ان جملوں میں کون سی پھبتی ہے، کون سی فقرے بازی ہے۔ میر کی، حزیں اور خاقانی کی عظمت کا [illegible] ان کی شاعری پر ہے ان کی مہارتِ عروض پر نہیں۔ میرے [illegible] میں ان کی شاعرانہ عظمت زیرِ بحث نہیں۔ وزن کی غرض ترنم آفرینی ہے۔ اگر کوئی شاعر خواہ وہ کتنا بڑا ہو عروض علم کے سارے [illegible] برتنے لگے جو ترنم کو مجروح کریں تو میں ضرور حرف گیری کروں گا اور اس سے ان کی شاعرانہ حیثیت پر کوئی حرف نہ آئے گا۔ ان زحافات کا غیر مترنم ہونا اس سے ظاہر ہے کہ اردو میں تو ان کی کوئی مثال دیکھنے ہی میں نہیں آتی فارسی میں بھی یہ اس حد تک نامقبول ہیں کہ ان کی حیثیت استثنائی ہے۔ حزیں کے بارے میں عرض ہے کہ خانِ آرزو نے حزیں کے دیوانِ چہارم کے چار سو اشعار کو غلط ٹھہرایا۔ میں نے حزیں کے جن اشعار کو نقل کیا ہے انھیں خان آرزو نے غیر موزوں قرار دے کر شیخ کی غلطی نکالی۔ آرزو تو بڑے عالم تھے فارسی کے مزاج داں تھے۔ ممکن ہے عروضی احتساب میں ان سے سہو ہو گیا ہو لیکن اہم یہ ہے کہ ان اشعار کی بے وزنی انھیں بھی کھٹکی۔ اردو کا کوئی عروضی شاعر اپنی عروضی مہارت دکھانے کے لیے مصرعوں میں اسی قسم کے اجنبی غیر مترنم زحافات سے کام لے تو کوئی عروضی انگلی نہ اٹھائے گا لیکن سردار جعفری یا دوسرے شعرا کسی ایسی مترنم ترمیم سے بھی کام لیں جو ہمیشہ سے اردو شاعری میں رائج رہی ہے (لیکن معصوم عروضیوں کو اس کی اس لیے خبر نہیں کہ انھوں نے عربی فارسی عروض پڑھا ہے اردو شاعری کا مطالعہ نہیں کیا) تو ہمارے عروضی اسلحات جنگ لے کر سامنے آ جاتے ہیں۔ مجھے اسی جامد عروض اور اس کی آفریدہ تقلیدی ذہنیت پر جھلاہٹ ہے۔ میں نے اس کے لیے درشت الفاظ استعمال کیے ہیں کسی فرد کی شاعری کے لیے نہیں۔

ڈاکٹر آہ کا مسلک ہے کہ ابتداءً اصول فن سے وضع کیے گئے لیکن ابتدا کے بعد فن کو اصول کی متابعت ضروری ہے۔ فرد واحد تو ان میں ترمیم کا مجاز ہے ہی نہیں ہاں کسی ترمیم کے بارے میں کوئی مذاکرہ یا کانفرنس کی جائے اور ردّ و قدح کے بعد ارباب دانش اسے مان لیں تو جائز ہے۔ مثال میں انھوں نے موسیقی اور رقص کے فن کو پیش کیا ہے۔ اس مبہم طریقے کے تحت کون طے کرے گا کہ ارباب دانش کی اکثریت نے توسیعِ اصول کی منظوری دی کہ نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر آہ ابتداءً وضع کردہ اصولوں میں کوئی ترمیم پسند ہی نہیں کرتے۔

عرض یہ ہے کہ کوئی بھی فن لطیف ایسا جامد نہیں جیسا ڈاکٹر صفدر آہ سمجھتے ہیں۔ ہندوستانی کلاسکی موسیقی کا ماخذ شاستر ہیں لیکن بعد میں بھی اس فن میں توسیع اور اضافے ہوتے رہے مثلاً امیر خسرو

؎ بحر الفصاحت بار اوّل نول کشور پریس ص ۲۱۰

سے کئی راگوں اور ترانہ وغیرہ کا اضافہ کیا۔ میاں تان سین، کی ٹوڑی میاں ملہار۔ بلاس خانی ٹوڑی وغیرہ فرد واحد کے کارنامے ہیں۔ خیال کی پوری گائکی بہت بڑی ترمیم ہے۔ اس کے باوجود مجھے تسلیم ہے کہ استادی موسیقی میں ارتقا کی رفتار بہت سست رہی ہے جس کی وجہ سے یہ ملک کی بہت بڑی اکثریت کے مذاق سے بالکل بیگانہ ہو گئی ہے۔ کیا ہمارے عروضی یہ چاہتے ہیں کہ اردو شاعری بھی فرسودہ اصولوں میں جکڑ کر استادی موسیقی کی طرح چند خواص تک محدود ہو کر رہ جائے۔ اصولوں کا ایک نقطے پر ٹھہر جانا فن کی موت ہے۔ سنسکرت قواعد اور لسانیات کی سب سے محترم شخصیت پانینی کی ہے جو پانچویں صدی قبل مسیح میں ہوا۔ اس نے سنسکرت جیسی ترقی یافتہ اور پیچیدہ زبان کے قواعد نفس اتنے مختصر الفاظ میں محفوظ کیے۔ اس کے بعد سنسکرت بولنے اور لکھنے والوں کو ان قواعد سے سرمو تجاوز کرنے کی اجازت نہ رہی۔ مثل مشہور ہو گئی کہ اگر کوئی پانینی کے قواعد میں ایک حرف کی ترمیم بھی کر سکے تو یہ اتنا بڑا کارنامہ ہو گا جیسے تخت کے گھر بیٹا ہونا۔ انڈو آرین اور ہندی میں ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی نے لکھا ہے کہ پانینی کے اصولوں کی سخت گیری سے سنسکرت کا ارتقا اس حد تک رک گیا کہ وہ مردہ زبان ہو گئی۔

عروض کے لیے ڈاکٹر صفدر آہ کا فرمان ہے کہ عربی فارسی کتب میں جو لکھ دیا گیا وہ اردو کے لیے حرف آخر ہے۔ اہل اردو کو اس میں کسی توسیع کی اجازت نہیں۔ انھوں نے یہ نظر انداز کر دیا کہ عروض کے واضع اصلی کے بعد عربی ہی نہیں فارسی میں بھی کئی علماء نے نہ صرف نئے زحافات نکالے بلکہ نئی بحروں کا بھی اضافہ کیا۔ پھر اردو کو یہ حق کیوں نہیں۔ اردو کیوں معیار الاشعار سے آگے نہ بڑھے۔ مجھے حالی کی مثنوی تعصب و انصاف کے چند شعر یاد آتے ہیں۔

جس جزیرے میں ہوئے تھے پیدا　　اپنی لے دے کے وہی تھی دنیا

تھے خدا کے وہی مناڈیں نام　　اور لینا تھا وہاں نام حرام

تھی اسی نسخہ پہ موقوف شفا　　جو تھا بقراط نے ترتیب دیا

ٹوٹ سکتی تھی نہ واں رائے قدیم　　تھا امٹ لکھ گئے سو اگلے حکیم

واں کسی طرح نہ ممکن تھا خلا　　واں نہ پانی تھا مرکب نہ ہوا

سب کی گدی پہ لگی تھیں آنکھیں　　کچھ نہ آگے نظر آتا تھا انھیں

بو نئی شے کی جو پا لیتے تھے　　ناک بن دیکھے چڑھا لیتے تھے

ڈاکٹر صفدر آہ کا عقیدہ بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ؎

ہے امٹ لکھ گئے جو اگلے حکیم

میں صرف آسمانی صحیفوں کو یہ مرتبہ دوں گا کہ ان میں جو لکھا ہے وہ امٹ ہے (حالانکہ ایک نبی پر اترے ہوئے صحیفے کو بھی بعد کے نبی نے منسوخ کیا ہے)۔ ارضی علوم سے متعلق کسی فاضل کی تحریر کو حرف آخر نہیں مان سکتا۔ کسی علم و فن کا کوئی ایسا ماہر نہیں ہوا جس کی تحریروں سے اختلاف نہ کیا گیا ہو یا جن پر اضافہ نہ کیا گیا ہو۔ افلاطون کے نظریوں سے ارسطو نے اختلاف کیا اور ارسطو پر اخلاف نے اضافے کیے۔ دوسری صدی عیسوی کے بہت بڑے منجم بطلیموس کا نظریہ تھا کہ زمین ساکت ہے جس کا سورج اور سیارے طواف کرتے ہیں۔ سولھویں صدی عیسوی میں ایک ستارہ شناس کوپرنکس نے ترمیم کی کہ سورج ساکت ہے اور زمین اس کے گرد گھومتی ہے۔ ماضی پرستوں نے کیا کیا ہنگامہ نہ کیا۔ اس نظریے کے حامیوں پر یہاں تک تشدد کیا گیا کہ بعض کو جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ لیکن آخر کار زمانے نے مان لیا کہ سابق کا مشہور زمانہ منجم غلطی پر تھا۔ نیوٹن جیسے عالم کے نظریات میں آئن سٹائن نے ترمیم کی اور آئن سٹائن کے نظریے پر نارلیکر جیسے نوجوان ہندوستانی سائنسداں نے اضافہ کیا ہے۔ ان مثالوں کے ہوتے میں اس مطالبے کو تسلیم نہیں کر سکتا کہ عہد قدیم کے کسی محترم عالم کے نظریوں سے اختلاف کرنا گویا اپنی عاقبت خراب کرنا ہے۔ محقق طوسی اور معیار الاشعار کی بڑائی مجھے تسلیم ہے لیکن یہ نہیں مان سکتا کہ ان کتابوں میں جو کچھ لکھا ہے آئندہ نسلیں بالخصوص اہل اردو اس کے اسیر ہو کر رہ جائیں۔ معیار الاشعار میں عربی عروض پر اضافہ کیا گیا ہے کوئی وجہ نہیں کہ اہل اردو معیار الاشعار کے فارسی عروض پر اضافہ نہ کریں۔ اردو میں یہ اضافہ شدت سے ہوا ہے لیکن یہ عروضیوں نے نہیں کیا شعرا نے کیا ہے۔ چند پوست کندہ حقیقتیں پیش کرنے کی اجازت دیجیے۔

۱۔ ہندوستانی موسیقی عرب و ایران کی موسیقی سے مختلف ہے اس لیے عربی فارسی عروض جیوں کا تیوں اردو کے لیے ناکافی ہے۔ اس میں ترمیم و توسیع کی ضرورت ہے۔

۲۔ مروجہ عروض نے بعض ایسے زحافات اور اوزان کو جائز قرار دیا ہے جو اہل اردو کے کان کو غیر مترنم معلوم ہوتے ہیں۔ ان زحافات کے غیر مترنم ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ اردو کے اچھے شعرا نے انھیں استعمال نہیں کیا۔ اردو میں انھیں ناجائز قرار دینا چاہیے۔

۳۔ اردو شعرا نے بالاتفاق عربی فارسی عروض کے بعض اوزان میں ایسی ترمیمیں روا رکھی ہیں جو کتب عروض کے لحاظ سے ناجائز ہیں۔ لیکن یہ دیکھتے ہوئے کہ اردو شعرا اور قارئین کی جماعت کا ان پر اتفاق ہے انھیں عروض میں داخل کر لینا چاہیے۔

میں نے اپنے مضمون اردو کی ہندی بحریں میں توسیع اور اضافے میں ایسی ہی ترمیموں کی نشان دہی کی ہے لیکن ڈاکٹر صفدر آہ نے

(باقی صفحہ [illegible] پر)

جگنو

سطوت رسول

شب کے یہ زرد یہ زرّیں جہاں
جگمگاتے ہیں سبزہ و گل پر
پتّی پتّی پہ رقص کرتے ہیں
جھیل کے پاس اُن ببولوں پر
نیلی رنگت جھلملاتے ہیں
اور پانی پہ عکس پڑتے ہیں!
یہ دئے "جیسے نجم جھلملاتے ہیں
سینکڑوں رنگ ڈوب جاتے ہیں؟

ذہنِ شاعر

سلیم مقصود

ایک بیوہ کی جوانی کی طرح وحشت ناک
ایک اجڑے ہوئے ویران سے مدفن کی طرح ہیبت ناک
دستِ مفلس کی طرح یہ کبھی خالی خالی
ایک بے بس کی تمنا کی طرح جھنجلایا!
بھوکے انسان کے دریدہ سے لبادے کی طرح مٹیالا
نیم عریاں کبھی دیوانہ: وحشی کی طرح
کبھی مہکا ہوا تقدیس سے عنبر کی طرح
کبھی آلودہ تعفن سے بھرے
ایک دیوانے کے ملبوس کے ٹکڑے کی طرح
کسی درویش کے کشکول کی مانند ہے کبھی
ڈال جاتا ہے کوئی طنز کے کھوٹے سکے
پھینک جاتا ہے تنفر کے کوئی انگارے
کوئی جلتے ہوئے احساس کا پگھلا لوہا
جھونک دیتا ہے کبھی اس میں یونہی بے بوجھے

پہچان

خلیل تنویر

قمقمے
جگمگاتی سڑکیں
جس طرف دیکھئے!
نور ہی نور
آنکھیں حیران ہیں
کاش اس وقت کہیں
تھوڑا سا اندھیرا ہو جائے
جس میں!!
اپنی کھوئی ہوئی تصویر کو پہچان سکوں!!!

غزلیں

وسیم بریلوی

دعا کرو کہ کوئی پیاس نذرِ جام نہ ہو
وہ زندگی ہی نہیں ہے جو ناتمام نہ ہو
جو مجھ میں تجھ میں چلا آ رہا ہے صدیوں سے
کہیں حیات اسی فاصلے کا نام نہ ہو
کوئی چراغ نہ آنسو نہ آرزوئے سحر
خدا کرے کہ کسی گھر میں ایسی شام نہ ہو
عجیب شرط لگائی ہے احتیاطوں نے
کہ تیرا ذکر کروں اور تیرا نام نہ ہو
صبا مزاج کی تیزی بھی ایک نعمت ہے
اگر چراغ بجھانا ہی ایک کام نہ ہو
وسیم کتنی ہی صبحیں لہو لہو گزریں
اک ایسی صبح بھی آئے کہ جس کی شام نہ ہو

شاہد کبیر

زندگی کے لوازمات کے ساتھ
چاند سجتے رہیں گے رات کے ساتھ
شہر میں کون پوچھتا تھا ہمیں
ساری شہرت ہے تیری ذات کے ساتھ
آپ کیوں دیکھ کے پریشاں ہیں
ہم تو آئے ہیں اک برات کے ساتھ
ایک لمحہ بھی اب غنیمت ہے
جو گزر جائے اپنی ذات کے ساتھ
یہ اندھیرا، یہ غم، یہ تنہائی
ہم کہاں آ گئے حیات کے ساتھ

اطہر عزیز

جب بھی دیکھو لرزتا رہتا ہے
دل نہیں، اک چراغِ صحرا ہے
ان اجالوں کی تم نہ بات کرو
ان سے اپنا پرانا جھگڑا ہے
تم جھنجھوڑو گے جا کے کس کس کو
شہر کا شہر جب کہ بہرا ہے
ہوگا دن کا تھکا ہوا سورج
اس اندھیرے میں کون آیا ہے
موت ہے وہ طویل بیداری
زندگی جس کا ایک وقفہ ہے
دو گھڑی تو ذرا ٹھہر جاؤ
کتنی مدت کے بعد دیکھا ہے
کتنی صدیوں کے داغ روشن ہیں
دل میں پھر بھی گھنا اندھیرا ہے
تم ہی اطہر ذرا بڑھا کے قدم
وقت کب ساتھ ساتھ چلتا ہے

جمال نقوی

رہا کر دے صیاد مجھ کو قفس سے
اگر قوتِ بال و پر دیکھنا ہے
زمانے پہ تنقید کرنے سے پہلے
ہمیں اپنے عیب و ہنر دیکھنا ہے
مبادی ہے جس کے لیے زندگانی
وہ کب تک رہے بے خبر دیکھنا ہے
ابھی میری قسمت میں منزل نہیں ہے
مجھے یوں ہی گردِ سفر دیکھنا ہے
جمال ابتدائے محبت میں ہم کو
ابھی تو ہر اک کی نظر دیکھنا ہے

صفحہ ۴ سے آگے

اس مضمون کو دیکھے بغیر ہی اس کا استہزا کیا ہے دہی ع

ناگ بن دیکھے چڑھا لیتے تھے والا معاملہ

ہے۔ وہ دعا مانگتے ہیں کہ خدا اس مضمون سے بچائے۔ اتفاق سے یہ مضمون بڑی موقر جگہ زیر اشاعت ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کو پیش کی جانے والی یادگاری جلد میں۔ آہ صاحب یہ دعا مانگیں کہ خدا اس جلد کو ان کی نظر سے بچائے۔ اس طرح وہ اس مضمون سے محفوظ رہیں گے اور یہ جلد ان کی نظروں سے محفوظ رہے گی۔ میں نے اس مضمون میں بحر متقارب میں جس ترمیم و اضافہ کی تجویز کی ہے وہ صرف وہی ہے جو دکنی شعرا سے لے کر میر، سودا، نظیر، حالی، یاس، سیماب، یگانہ، فراق اور سردار جعفری تک کے یہاں ملتی ہے۔ یہ ترمیم ایک اصول کے تحت ہے اس مختصر مضمون میں اس کی تفصیل دینا ممکن نہیں۔ میں نے عروض پر ایک ہی نہیں کئی مضامین لکھے ہیں جو بہت موقر مجموعوں یا جریدوں میں زیر طبع ہیں۔ ان میں سے ہر ایک غور و خوض کا نتیجہ ہے۔ میں ان کی نشان دہی نہیں کرنا چاہتا مبادا ڈاکٹر صفدر آہ صاحب کے دل پر کوئی ناخوشگوار اثر ہو۔

ڈاکٹر موصوف کو ہندی عروض کے متعلق کچھ غلط فہمیاں ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اردو اور ہندی عروض بالکل مختلف ہیں۔ لکھتے ہیں۔

'متقارب اوزان کی بحر ہے اور سویا ماتروں کی بحر ہے'

'اوزان کی بحر ہے' یہ فقرہ مہمل ہے۔ وزن تو ہندی عروض میں بھی ہوتا ہے انگریزی میں بھی آہ صاحب کو یہ معلوم نہیں کہ اردو عروض کی بنیاد کس اصول پر ہے۔ اردو عروض کا انحصار ہے لفظی جزو (SYLLABLE) کے طول پر۔ میرا تازہ ترین انکشاف یہ ہے کہ اردو کے بعض اوزان میں لفظی جزو کا بل (SYLLABIC STRESS) بھی شدت سے کارفرما ہوتا ہے لیکن یہ استثنائی صورتوں میں ہوتا ہے۔ ہندی عروض میں دو قسم کے اوزان ہیں ماترائی اور ورنک (یعنی لفظ کے جزو سے متعلق) چونکہ لفظی جزو کا طول ماترا کے طول کا تابع ہے اس لیے عملاً ماترائی اور ورنک دونوں قسم کے اوزان لفظی جزو کے طول ہی پر مبنی ہیں۔ اردو اور ہندی عروض کی اس بنیادی شباہت کی وجہ سے ہندی اور اردو عروض میں متعدد اوزان مشترک ہیں مثلاً بحر متقارب متدارک، رمل، ہزج، رجز مثمن سالم سب ہو بہو ہندی میں موجود ہیں۔ بجز دوسرے اوزان کے یہ اوزان بھی ہندی میں پائے جاتے ہیں۔

۱۔ فعولن فعولن فعولن فعل

۲۔ مفعول فاعلاتن مفعول مفاعلاتن

۳۔ مفاعلن مفاعلن مفاعلن مفاعلن

'سویا ماتروں کی بحر ہے' یہ کہنا نیم صداقت ہے کیونکہ سویا ماترائی کم اور ورنک اکثر ہوتا ہے۔ میرے سامنے سویا کی ایسی ۲۱ اقسام ہیں جو ماترائی نہیں مثلاً دومل، اروند، کریٹ، مسود وغیرہ ڈاکٹر آہ کا خیال ہے کہ سویا اور متقارب میں کوئی اشتراک نہیں۔ ذکر تھا صرف بحر متقارب اثرم یا اثلم شانزدہ رکنی کا۔ میرا کہنا ہے کہ سویا ان دو اوزان سے وسیع تر بحر ہے اور یہ متقارب کے ان دو اوزان کے سب امکانات کا احصار کر لیتی ہے۔

لکھتے ہیں 'متقارب کے دو کے ہوئے مصرعے سویا میں نہیں آسکتے'۔ میری رائے میں بہت سی صورتوں میں آسکتے ہیں مثلاً ایک مصرع لیجئے ع

جہاں مساجد اور شوالے اند اللہ سے پڑھ کر ہوں گے

اس میں جہاں مساجد بروزن فعل فعولن ہے اور اس لیے متقارب کے مندرجہ بالا اوزان سے خارج ہو جاتا ہے لیکن ۳۲ ماتراؤں کا سمان سویا اسے بخوبی قبول کرے گا۔

اردو اور ہندی عروض کی مماثلت کی وجہ سے اردو شعرا نے گیتوں ہی نہیں نظموں اور غزلوں میں بکثرت ہندی بحریں استعمال کی ہیں اور غالباً یہ غیر شعوری طور پر ہوا ہے مثلاً ذیل کے اشعار ہندی کی بحر سرسی میں ہیں۔

۱۔ روپ بدلے شالہ بدلے بدلا ہندوستان

تو بھی اے فرزند کہستاں اپنی خودی پہچان (اقبال)

۲۔ مجبوروں کا تاریک خرابہ ہے میری جاگیر

(لیق حنفی نظم 'تعارف')

۳۔ ہونٹ گلابی نین شرابی مکھڑا بدر منیر

کچھ تو بتا اے دل یہ ہے کس ناری کی تصویر

(ناصر شہزاد کی غزل)

پرانے صوفیوں نے ہندی بحروں کے استعمال میں غلطی ضرور کی ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ابتدائی صوفیا نے ہندی بحریں استعمال کی ہیں اردو نہیں۔ بعض صوفی تو ہندی بحروں میں اچھی نظر رکھتے تھے مثلاً شیخ خوب محمد چشتی گجراتی نے ایک مثنوی چھند چھنداں لکھی ہے جس کے پہلے حصے میں ہندی پنگل کا بیان ہے اور دوسرے میں اردو عروض کا۔ مثنوی کی بحر ہندی ہے۔

بحر متقارب مثمن کا پہلا مصرع سالم ارکان میں ہو اور دوسرے کا آخری رکن ابتر یعنی فع ہو تو ڈاکٹر صفدر آہ کے نزدیک یہ فرق بالکل اتنا ہی ہے جتنا رباعی کے مختلف اوزان کا۔ اس سادگی پر قربان ہونے کو جی چاہتا ہے۔ میرا اعتراض ہے مصرعوں کے نابرابر طول پر وہ دلیل لا رہے ہیں ان اوزان سے جو طول میں برابر ہیں گو ان میں اندرونی اختلافات ہیں۔ اردو میں شعر یا نظم میں جن اوزان کا اجتماع جائز ہے ان کے طول میں ایک سبب خفیف یعنی دو حرفوں کے فرق کی بھی اجازت نہیں۔ ذوق نے شاعرے میں شعر پڑھا تھا

ہاتھ میں خاتم لعل ہے گر اس میں زلفِ سرکش ہو
پھر زلف سے وہ دست ہوس جس میں اضطراب و کشش ہو

پہلے مصرع میں ایک سبب خفیف کی کمی تھی جس پر شاہ نصیر نے طنز کیا تھا اور ذوق نے فوراً مصرع کے شروع میں جس کا اضافہ کرکے مصرعوں کو برابر کر لیا تھا۔ آزاد نظم میں مصرعوں کے طول میں کمی بیشی جائز ہے۔ اگر ایک مصرع فعولن فعولن فعولن فعولن ہو اور دوسرا فعولن فعولن فعولن فع تو یہ پابند نظم نہ رہ کر آزاد نظم ہو جائے گی۔ رباعی کے چوبیس مصرعوں کا طول بالکل برابر ہوتا ہے۔ رباعی کے ۱۲ اوزان ۲۰ حروف یا ۳۰ ماتراؤں کے ہوتے ہیں اور بقیہ بارہ اوزان ۲۱ حروف یا ۳۱ ماتراؤں کے ہوتے ہیں۔ مصرع کے آخر میں ایک ساکن حرف کے اضافے سے طول میں کوئی فرق نہیں پڑتا اس لیے رباعی کے اوزان آزاد نظم کی تشکیل نہیں کرتے۔

اپنے مضمون کے آخر میں ڈاکٹر آہ نے حکم لگایا ہے کہ میرے سلسلۂ مضمون میں کوئی بھی بات نئی نہ تھی سب پیش پا افتادہ باتیں تھیں۔ وہ اگر دیکھنا نہ چاہیں تو دوسری بات ہے ورنہ اس مضمون میں کچھ تو قابل توجہ تھا۔ مثلاً (۱) متعلقہ بحث میں نو مراسلے شایع ہو چکے تھے کسی نے اس طرف توجہ نہ کی تھی کہ جن غلطیوں کا الزام سردار جعفری کو دیا جاتا ہے وہ سودا، میر، نظیر، حالی، یاس، سیماب، فراق اور جوش جیسے شعرا بھی کر چکے ہیں۔

(۲) عام خیال یہ ہے کہ بحر متقارب کے متعلقہ اوزان اردو شاعری نے عربی فارسی عروض سے لیے۔ میں نے اردو شاعری کی گذشتہ تاریخ میں ان اوزان کا تعاقب کیا تو یہ انکشاف ہوا کہ اردو نے انھیں اصلاً ہندی سے لیا ہے بعد میں انھیں فارسی عروض کے سانچے میں ڈھال دیا گیا لیکن اس عمل میں بعض امکانات کی گرفت کی گئی اور بعض نظر انداز ہو گئے لیکن شعرا ان میں بھی شعر کہتے رہے (۳) عروض سے متعلق مضامین اور کتب میں یہ تجویز تو دیکھنے میں آئی ہے کہ اردو کو عربی فارسی عروض کی جگہ ہندی پنگل اختیار کر لینا چاہیے۔ میری تجویز اس سے مختلف ہے اردو کو موجودہ عروض برقرار رکھنا چاہیے لیکن اس کے اوزان میں وہ ترمیم اور اضافے کر لینے چاہئیں جن کا اردو شاعری میں عام طور سے چلن رہا ہے۔

ڈاکٹر صفدر آہ کی طرح میں بھی شعر میں اتباعِ وزن کو لازم سمجھتا ہوں لیکن فرق یہ ہے کہ وہ اردو کو قرونِ وسطیٰ کے عربی فارسی عروض سے آگے جانے کی اجازت نہیں دیتے۔ میں شاعری کی طرح عروض میں بھی ارتقا کا قائل ہوں کیونکہ اردو شعرا نے اصولوں کے تحت اوزان کو آگے بڑھایا ہے۔ ڈاکٹر آہ جدیدیت کے نام سے بیزار ہیں لیکن کیا کیا جائے زندگی قدیم کے بیچ نہیں جدید کے بیچ گزارنی ہے۔ زندگی کے موجود لمحے آنے والا لمحہ جدید ہے اور ہمیں اس میں داخل ہونا ہے۔ اس کے فوراً بعد ایک اور جدید لمحہ سے ہمیں اس تک پہنچنا ہے اس طرح زندگی مسلسل جدید سے دوچار ہونے کا نام ہے۔ آپ جدیدیت سے کتنے ہی بیزار ہوں لیکن زندگی اور شاعری مسلسل جدید کی طرف گام زن ہیں۔ اگر جدید کے خوشگوار پہلو کو قبول کرنے سے اجتناب کیا تو ہم تقویمِ پارینہ ہو کر رہ جائیں گے۔

یٰسین انور

مکتوب لندن

انگریز طالبات کے لیے اردو کلاسیں

ڈاروِن گرامر اسکول کے ہیڈ ماسٹر ایچ۔ آر۔ ایبٹ کی ذاتی کوششوں سے مذکورہ اسکول میں اردو کو بطور اختیاری مضمون کے نصاب میں شامل کرلیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں اردو کی باقاعدہ کلاسوں کا انتظام ہوگیا ہے۔ یہ کلاسیں انگریز طالبات اور خصوصاً جی۔ سی۔ ای (ایڈوانس) درجہ کی طالبات کے لیے شروع کی گئی ہیں، تاکہ یہ طالبات تعلیم کی تربیت حاصل کرنے کے بعد اردو دان تارکین وطن کے بچوں کو تعلیم دے سکیں۔

مسٹر ایبٹ برطانوی فوجی افسر کی حیثیت سے غیر منقسم ہندوستان میں کافی عرصہ ملازمت کرچکے ہیں اور انھیں اردو پر خاصا عبور حاصل ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ایچی سن کالج لاہور کے ایک سابق لکچرار مسٹر نسیم احمد باجوہ کی خدمات بھی حاصل کرلی ہیں جو طالبات کو اردو کی تعلیم دیں گے۔

وزارت تعلیم سے مطالبہ

ڈاکٹر غلام صابر ہیچ۔ پی نے پارلیمانی سکریٹری آف اسٹیٹ مسٹر ڈینس ہاؤل سے مانچسٹر کے تارکین وطن کی جانب سے تحریری مطالبہ کیا ہے کہ ٹیمپل جونیر اسکول چیتھم ہل کی انتظامیہ اور مقامی ایجوکیشن اتھارٹی کو ہدایت کی جائے کہ وہ تارکین وطن کے بچوں کی دینی تعلیم کا انتظام کریں۔ مذکورہ اسکول کی انتظامیہ نے صفائی اور نگہداشت کی دقتوں کی بنا پر دینی مدرسہ کے لیے اسکول کی عمارت استعمال کرنے کی اجازت دینے سے انکار کردیا تھا۔

ڈاکٹر غلام صابر نے اپنے خط میں مزید مطالبہ کیا ہے کہ از روئے قواعد چونکہ تارکین وطن کے بچوں کی ہر قسم کی تعلیم (جس میں مذہبی تعلیم بھی شامل ہے) کی ذمہ داری مقامی ایجوکیشن اتھارٹی پر عائد ہوتی ہے اس لیے تمام متعلقہ اتھارٹیوں سے کہا جائے وہ ان بچوں کی اردو، پنجابی، عربی، ہندی اور قرآن کی تعلیم کا ذمہ لے کر اس کا مناسب انتظام کریں۔

ماہنامہ نئی صدی کا اجرا

لندن سے ایک نیا ادبی ماہنامہ 'نئی صدی' کا پہلا شمارہ نومبر میں منظر عام پر آگیا۔ پہلے شمارہ میں ہند و پاکستان کے اہم اہل قلم کے رشحات شامل اشاعت ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صدر جمہوریہ ہند نے اپنے ایک خط میں نئے جریدہ کی کامیابی کی دعا کی ہے اور مدیر نئی صدی کو اردو کی خدمت پر مبارکباد دی ہے۔ یہ خط بھی پہلے شمارہ کی زینت ہے۔ اس ماہنامہ کے مدیر ایک ہندوستانی سکھ ہیں۔ امید ہے آئندہ اشاعتوں میں کتابت اور طباعت کی خامیوں پر توجہ دی جاسکے گی۔

ماہنامہ 'آفاق' نومبر

سیمے ادیب دوست، اڈیٹر شیر لندن

اے۔ ڈی۔ اظہر کی مزاحیہ شاعری پر ایک مختصر تبصرہ ایڈیٹر محمود صاحب نے کیا ہے۔ انتخاب کلام ملاحظہ ہو۔

جو میں نے پوچھا کہ پیارے اظہر تو کر دل مری جاں کہاں سے پہلے
ہنسے کہ نیکی کا پوچھنا کیا چلا ہے چاہو جہاں سے پہلے
اٹھا جو خنجر بدست ساقی رہی نہ مستی کسی کی باقی
ہر ایک میکش کے منہ سے نکلا وہاں سے پہلے وہاں سے پہلے
بڑی مدت کے بعد اس کو شراب مفت ہاتھ آئی
ہوئی ہے شیخ کے ایمان کی تجدید کہتے ہیں
کراچی میں گرتے ہوئے سب یار بیٹھے ہیں
جو بیاہے جا چکے اک بار پھر تیار بیٹھے ہیں
اور اب جو لطف ہے وہ نائل کرم بھی ہوئے
تو بدحواسی میں ہم کہہ گئے "جناب نہیں"
لندن میں آکے شیخ کے بچھ اور پر لگے
اب اور بھی ہنر میں مشقت مآب ہیں

نظم

ناؤ اور ساگر

یٰسین انور

لہر لہر ناؤ جارہی ہے بھنور بھنور دل دھڑک رہا ہے
نصیبی ہر جبیں ہیں شعلہ افشاں تمام ساگر بھڑک رہا ہے
صعوبتیں سر اٹھا رہی ہیں، بلاکتیں مسکرا رہی ہیں
وہ خوف برق و شرر ہے طاری فضائیں آنسو بہا رہی ہیں
اتھل پتھل ہو رہا ہے ساگر بھنور بھنور پیچ و تاب میں ہے
لہر لہر تھرتھرا رہی ہے کہ مبتلا صد عذاب میں ہے
ادھر تو بادل چنگھاڑتے ہیں، ادھر بھی موجیں دہاڑتی ہیں
وہ یورشیں برق دبا رکھی ہیں کہ پائے ہمت اکھاڑتی ہیں
یہ چشم گرداب کی گردش کہ ساگر آنکھیں دکھا رہا ہے
ہے بحر شعلہ مزاج برہم کہ جھاگ منہ سے اڑا رہا ہے
ہزار موجوں کے زیر سایہ ہزار طوفان پل رہے ہیں
اتھاہ گہرائیوں سے مجھ پہ فتنے اچھل رہے ہیں
اگر مسافر کی زندگی کو یہی مصائب سنوار دیں گے
تو ناؤ ڈوبے۔ ڈر ہے کہ آؤ، ہمارے ساگر اتار دیں گے

مراسلہ

آغا خلش کاشمیری کے مراسلے کے بارے میں

"ہماری زبان" مورخہ ۱۵ر اکتوبر ۱۹۶۷ء میں جناب آغا خلش کاشمیری کا مراسلہ نظر سے گزرا جس میں انھوں نے ڈاکٹر سید محمد حسنین کے مضمون "اردو زبان کی تعلیم اور اردو کے ذریعے تعلیم کے مسائل" (مطبوعہ "ہماری زبان" مورخہ ۱۵ر اگست ۱۹۶۷ء) پر صحتِ زبان کے نقطۂ نظر سے کچھ اعتراض کیے ہیں اور بعض تحریری لغزشوں کی نشان دہی کی ہے۔ اس سے پہلے بھی ان کے اس نوع کے مراسلے "ہماری زبان" میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ آغا صاحب کے اعتراضات سے ظاہر ہے کہ وہ زبان کے معاملے میں سخت طہارت پسند (PURISTS) واقع ہوئے ہیں، اور الفاظ، ترکیبِ الفاظ، معانی، اشتقاق، حرکات اور عطف و اضافت کے باب میں صحت اور اصولِ صحت کی عائد کی ہوئی پابندیوں کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ رجحان قابلِ قدر اور یہ ذوق لائقِ ستائش ہے۔ خدا انھیں توفیق دے۔ اسے ضرور اس صحت پسندی سے کام لینا چاہیے بشرطیکہ غلو سے دامن بچا رہے، یعنی مطلق صحت اور استعمالِ عام کے درمیان صحیح توازن کا درجہ کسی حال میں نظر انداز نہ ہو اور ان تصرفات و جدیدات کو جائز بالکل مرجح خیال کیا جائے جو فصحائے اردو کی زبان پر دائر و سائر ہیں۔ میں بھی جہاں تک میرا محدود علم ساتھ دیتا ہے، اسی ذوق کی پیروی کرتا ہوں، اور حتی الامکان اغلاط و مسامحات سے بچ کر لکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مثال کے طور پر آغا صاحب اپنے مراسلے میں مذکورہ مضمون کے جن الفاظ کو معرضِ بحث میں لائے ہیں، میں ان کو اسی طرح استعمال کرتا ہوں جس طرح آغا صاحب نے ظاہر کیا ہے کہ استعمال ہونے چاہییں، یعنی میرے نزدیک بھی "ٹکسال" مونث ہے، "طلباء" غلط اور "طلبہ" صحیح ہے، "ادائیگی" غلط اور "ادائی" صحیح ہے، "تعاون و تجربے" میں واو نہیں "اور" ہونا چاہیے، اور "دلگیر" کا لفظ "پسندیدہ" نہیں، "اداس اور غمگین" کے معنوں میں استعمال ہونا چاہیے۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آغا صاحب دوسرے لکھنے والوں سے صحتِ زبان کے جس معیار کا مطالبہ کرتے ہیں کیا وہ معیار خود ان کی تحریر میں پایا جاتا ہے؟ میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ کم سے کم ان کے زیرِ نظر مراسلے سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ جس نوع کے اسقام ان کو دوسروں کے یہاں نظر آتے ہیں اس نوع کے اسقام سے ان کی اپنی تحریر بھی خالی نہیں ہے۔ مراسلہ زیرِ نظر کے حسبِ ذیل مقامات ملاحظہ ہوں:-

(۱) سطر مراسلہ نمبر ۳ — "......... کشمیر کانفرنس میں پڑھائی مضمون........"

"کشمیر کانفرنس میں پڑھا جانے والا مضمون" یا "وہ مضمون جو کشمیر کانفرنس میں پڑھا گیا" لکھنا چاہیے تھا۔

میرے خیال میں تحریر کا یہ انداز موجودہ دور میں ہندی کے اثر سے اردو میں داخل ہوا ہے۔ اس کی بعض بہت ہی مکروہ مثالیں آج کل کی تحریروں خصوصاً اخباری تحریروں میں نظر آتی ہیں۔ چند نمونے درج کرتا ہوں: "دن بدن بڑھ رہی مہنگائی"۔ "گاندھی پارک میں ہو رہے جلسے کی کارروائی"، اور "ہندی میں فارسی عربی کے داخل ہو چکے الفاظ کو جوں کا توں رہنے دو۔"

(۲) سطر ۲ — "میں سوفی صد اتفاق نہ کر سکا۔"

صحیح روزمرہ "سوفی صدی" ہے

(۳) سطر ۳ — "...... اتفاق نہ کر سکا۔"

روزمرہ کے خلاف ہے۔ "اتفاق نہیں کر سکا" لکھنا چاہیے تھا۔

(۴) سطر ۸ — "میری نانی مرحومہ اکثر کشمیری زبان میں گفتگو کرتی تھی۔"

یہاں کوئی غلطی نہیں ہے، لیکن مروجہ آداب کی رو سے "نانی مرحومہ" کے لیے "گفتگو کرتی تھیں" استعمال ہونا چاہیے۔

(۵) سطر ۹ — "میری والدہ .... اردو زبان کی ٹانگ توڑنے کی ناکام کوشش کرتی تھیں۔"

اگر غور سے کام لیا جائے تو پتا چلے گا کہ "ناکام" کا لفظ نہ صرف غیر ضروری بلکہ مخلِ فصاحت ہے۔ کوئی شخص کسی زبان کو غلط سلط بولتا ہے تو گویا اس زبان کے محاورہ و روزمرہ کو مجروح کرتا ہے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ زبان کی ٹانگ توڑ رہا ہے، مطلب یہ کہ اس زبان کو بولنے کی ناکام کوشش کر رہا ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ ناکامی کا مفہوم "ٹانگ توڑنے" میں پہلے ہی موجود ہے۔ چنانچہ "ناکام" کا لفظ بالکل بے ضرورت استعمال کیا گیا۔ علاوہ بریں لفظ ناکام کے استعمال سے یہ معنی بھی پیدا ہو سکتے ہیں کہ "میری والدہ اردو زبان کی ٹانگ توڑنے کی کوشش کرتی تھیں مگر ناکام رہتی تھیں۔ یعنی غلط بولنے کی کوشش کے باوجود صحیح بولتی تھیں۔" گویا جو بات کہنی مقصود تھی اس کے بالکل برعکس بات کہی گئی۔ اگر ناکام کا لفظ استعمال کرنا ضروری ہی تھا تو "ٹانگ توڑنے" کے محاورے کو چھوڑ کر سیدھے سادے الفاظ میں کہنا چاہیے تھا کہ میری والدہ اردو زبان بولنے کی ناکام کوشش کرتی تھیں۔

(۶) سطر ۱۱ — "میرے والد .... مگر پنجابی زبان میں مخاطبت کرتے تھے۔"

اردو میں مخاطبت کا لفظ اپنے اصلی و لغوی معنوں میں استعمال

ہوتا ہے۔ یعنی کسی کے ساتھ مل کر کوئی کام کرنا۔ اس کو گفتگو کے معنی میں استعمال کرنا محض زبردستی ہے یا غیر ضروری جدت۔ خود آغا صاحب کے الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ "ٹکسالی یا مرکزی زبان ہے" اور یہ کہ کسی کو "یہ حق نہیں پہنچتا کہ اسلاف کے خلاف اجتہاد کی طرح ڈالتا رہے۔"

(۷) سطر ۱۳ — "پڑوس میں کشمیری گھرانے گاہے گاہے رگِ غیرت کو جھنجھوڑتے تھے۔"

"پڑوس کے کشمیری گھرانے" یا "پڑوس میں رہنے والے کشمیری گھرانے" لکھنا چاہیے تھا۔ محض "پڑوس میں" لکھنے سے بیان ناقص رہتا ہے۔

(۸) سطر ۱۴ — "رگِ غیرت کو جھنجھوڑتے تھے۔"

جذبۂ غیرت کو جھنجھوڑا جاتا ہے۔ رگِ غیرت کو نہیں جھنجھوڑا جاتا۔ رگ پھڑکتی ہے، جوش میں آتی ہے، جھنجھوڑی نہیں جاتی۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ "اس کی رگِ جنون پھڑکی" یا "اس کی رگِ حمیت جوش میں آئی۔"

(۹) سطر ۱۴ — "اللہ بس باقی ہوس کی حد تک۔"

یہاں اس کہاوت کا محل نہیں تھا۔ کہنا یہ چاہتے تھے کہ پڑوس میں رہنے والے کشمیریوں کو کشمیری زبان میں گفتگو کرتے ہوئے سن کر کبھی کبھی جذبۂ غیرت جوش مارتا تھا لیکن کچھ کرتے دھرتے بن نہیں پڑتی تھی۔ یہاں "اللہ بس باقی ہوس" کا نعرہ لگانے کی کیا ضرورت تھی؟

(۱۰) سطر ۱۵ — "حسین پورہ امرتسر میں بود و باش نے۔۔۔۔"

"میں" کی جگہ "کی" لکھنا چاہیے تھا

(۱۱) سطر ۱۷ — "اگر کاتب الحروف کشمیری الاصل ہونے کے ناتے سے۔۔۔۔۔۔"

"راقم الحروف" کی عام اور مانوس ترکیب کو چھوڑ کر "کاتب الحروف" استعمال کرنے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ باقی جملے میں "کشمیری الاصل ہونے کی حیثیت سے" یا "کشمیر الاصل ہونے کی بنا پر" لکھنا چاہیے تھا۔ کشمیری الاصل ہونے کے ناتے سے — تحریر یا بول چال کا یہ انداز بھی غالباً ہندی کے اثر سے اردو میں داخل ہوا ہے اور فصیح و مستند اردو سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا۔ کسی محتاط مصنف کی تحریر میں نہیں ملے گا۔

(۱۲) سطر ۱۸ — "۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اپنی فوقیت جتانے کی بڑ ہانکے۔"

لکھنا چاہیے تھا: "اپنی فوقیت جتائے اور بے وجہ بڑ ہانکے"

(۱۳) سطر ۲۱ — "۔۔۔۔ بھلا معلوم نہیں دیتا۔۔۔۔"

"بھلا نہیں معلوم ہوتا" لکھنا چاہیے تھا

(۱۴) سطر ۲۲ — "جہاں تک میرے علم کا علاقہ ہے۔۔۔۔۔"

یہاں لفظ علاقہ اس طرح استعمال ہوا ہے جس طرح کسی تعلقہ دار یا تحصیل دار کے علاقے کے ذکر میں استعمال ہوتا ہے۔

(۱۵) سطر ۲۵ — "ٹکسالی زبان کے کسی داعی کو یہ حق نہیں پہنچتا۔۔۔۔۔۔۔"

یہاں "داعی" کی جگہ "مدعی" زیادہ مناسب تھا۔

(۱۶) سطر ۲۵ — "ٹکسالی زبان کے کسی داعی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اجتہاد کی طرح ڈالتا رہے۔"

"اجتہاد کی طرح ڈالے" یا "اجتہاد کی طرح ڈالتا پھرے" لکھنا چاہیے تھا۔ "ڈالتا رہے" کا یہاں موقع نہیں تھا۔

(۱۷) سطر ۳۴ — "کسی ٹکسال یا مرد ادیب کو یہ حق باقی نہیں۔"

"باقی" کا استعمال بے محل ہے۔ "یہ حق حاصل نہیں" صاف اور سیدھا انداز بیان تھا۔

(۱۸) سطر ۳۵ — "۔۔۔۔۔۔۔۔ دونوں الفاظ کو۔۔۔۔۔"

"دونوں لفظوں کو" لکھنا چاہیے تھا۔ "الفاظ" دو سے زیادہ لفظوں کے لیے استعمال ہوگا جس طرح "دو شعراء"، "دو علماء"، اور "دو تصانیف" وغیرہ ترکیبیں غلط ہیں اسی طرح "دو الفاظ" یا "دونوں الفاظ" کی ترکیب غلط ہے۔

(۱۹) سطر ۳۸ — "ادلے ادائی، دغا سے دغائی اور حیا سے حیائی تو درست ہیں۔"

اردو قواعد کی رو سے "ہیں" کی جگہ "ہے" آئے گا۔

(۲۰) سطر ۴۲ — "۔۔۔۔۔ واؤ معطوفہ رکھدی ہے۔"

واؤ مذکر ہے، مونث نہیں۔

(۲۱) سطر ۴۲ — "تعاون و تجزیہ رہنے دیتے تو مضائقہ نہ تھا۔"

"مضائقہ نہیں تھا" چاہیے۔

(۲۲) سطر ۴۹ — "حال یہ ہے کہ ٹکسالی زبان کے شاعروں نے۔۔۔۔۔۔۔"

"حالانکہ" بالکل سامنے کی ترکیب تھی۔ اس کو چھوڑ کر "حال یہ ہے" استعمال کیا گیا جس کا یہاں موقع نہیں تھا۔

(۲۳) سطر ۴۹ — "۔۔۔۔۔۔ شاعروں نے دلگیری کو غم آلود ماحول کا ترجمان رکھا ہے۔"

"رکھا" اس جملے میں جس طرح رکھا گیا ہے اس نے جملہ کو کہیں کا نہیں رکھا۔

(۲۴) سطر ۵ — "میں چونکہ اردو زبان کا دیا کھاتا ہوں اس لیے امکان بھر کوشش کرتا ہوں کہ اس کے خد و خال سنور تے رہیں۔"

"خط و خال" استعمال کرنا چاہیے تھا۔ اصل اور مستند ترکیب "خط و خال" ہی ہے۔ لکھنے والوں نے عورت کے ذکر میں "خط" کو "خد" سے بدلنا ضروری سمجھا۔ یہاں عورت کا ذکر نہیں۔ (باقی صفحہ ۱۱ پر)

اردو کے سوا متحدہ محاذ کا سارا پروگرام پورا کیا جائے گا

لکھنؤ۔ لوک سبھا میں جن سنگھ گروپ کے لیڈر اور جن سنگھ کے صدر منتخب دین دیال اپادھیائے نے کہا کہ اردو کو ثانوی سرکاری زبان بنانے کے سوا ان کی پارٹی متحدہ محاذ کے ۲۴ نکات کے منشور کو پورا کرے گی۔ انھوں نے طلبہ سے اپیل کی کہ انگریزی زبان کے خلاف اپنی تحریک پر امن طور پر چلائیں۔ اس بل کے تحت انگریزی ہمیشہ کے لیے ملک کی ایک سرکاری زبان بن جائے گی۔ میری پارٹی کسی شخص پر اس کی مرضی کے خلاف ہندی ٹھونسنے کے خلاف ہے لیکن انگریزی کے تسلط کو بھی برداشت نہ کرے گی جس کی وجہ سے ہندوستانی شہری دوسرے درجہ کے شہری بن جاتے ہیں۔ (الجمعیۃ دہلی)

اُردو کو بھی ترقی کے مواقع ملنا چاہئیں۔ سوچیتا کرپلانی

نئی دہلی۔ یو۔ پی کی سابق وزیر اعلیٰ مسز سوچیتا کرپلانی نے لوک سبھا میں ان لوگوں کی سخت مذمت کی جو اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ہندی کو زبردستی مسلط کیا جا سکتا ہے۔

مسز کرپلانی نے جو سرکاری زبان سے متعلق ترمیمی بل اور متعلقہ رزولیوشن پر مباحثہ میں حصہ لے رہی تھیں ہندی میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ کسی بھی زبان نے طاقت کے بل بوتے پر ترقی نہیں کی انھوں نے کہا کہ زبان کے اندر خود اتنی کشش اور سادگی ہونی چاہیے کہ لوگ اسے بخوشی سیکھیں۔ مسز کرپلانی نے ہندی سینا اور اسی قسم کی دوسری تنظیموں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ اس قسم کی تنظیمیں ہندی کو فائدہ نہیں پہونچا سکتیں، اس کے برعکس یہ ہندی کو نقصان پہونچائیں گی۔ اور جو لوگ اس قسم کی سیناؤں کی تشدد آمیز سرگرمیوں میں نوجوانوں کو حصہ لینے پر اکساتے ہیں انھیں اس نقصان کا ذمہ دار قرار دیا جانا چاہیے۔

مسز کرپلانی نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ اردو کو بھی اس کی مناسب جگہ دی جانی چاہیے کیونکہ یہ ایک ہندوستانی زبان ہے اور اسی ملک میں پیدا ہوئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کی ترقی میں رکاوٹ نہ پڑنے دینا چاہیے۔

علاقائی زبانوں کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی حمایت

نئی دہلی: ممبران پارلیمنٹ کی تعلیمی کمیٹی کی رپورٹ پر اپنی رائے دیتے ہوئے متعدد ریاستوں نے سہ لسانی فارمولا کی تائید کی ہے جن ریاستوں نے رپورٹ پر اپنی رائے دی ہے ان کے نام یہ ہیں۔ جموں و کشمیر، میسور، بہار، آسام، مغربی بنگال، مدھیہ پردیش، اندھرا، ہماچل پردیش، گوا، دمن اور دیو، منی پور اور تریپور۔ ان میں سے زیادہ تر نے علاقائی زبان کو ہر سطح پر ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے اپنانے کی تائید کی ہے ناگالینڈ واحد ریاست ہے جس نے تیسرے درجے سے انگریزی کو بدستور پڑھانے رہنے کی رائے دی ہے۔ اس نے کسی ہندوستانی زبان کو فوری طور پر ذریعۂ تعلیم بنانے سے اپنی معذوری ظاہر کی ہے۔

انجمن ترقی اردو ہند شاخ بھاگلپور میں ماہنامہ مریخ کا اجراء

حلقۂ ادب بہار کے ریاستی ترجمان ماہنامہ "مریخ" کی رسم اجراء" ایوان ارشاد" خلیفہ باغ میں منائی گئی جس کی صدارت جناب آنند موہن سہائے سابق سفیر جاپان تھائی لینڈ نے فرمائی۔ اور افتتاح الحاج محمد توحید صاحب نے فرمایا دوران تقریر مریخ ہو صاحب نے کہا کہ اردو کسی خاص فرد یا جماعت کی زبان نہیں ہے بلکہ یہ تو ہندوستان کے پورے طول و عرض میں تمام افراد اور جماعتوں کے اتحاد و اتفاق کا مظہر ہے۔ حلقۂ ادب کے ترجمان "ماہنامہ مریخ" پر موصوف نے اظہار خیال فرمایا کہ یہ جریدہ ادب کی بلندیوں کا اسی طرح حامل ہوگا جس طرح "مریخ" بلند بام ہے۔ اور جس طرح انسانی تگ و دو چاند کے بعد ستارۂ مریخ تک پہنچنے کی ہو رہی ہے اسی طرح اس جریدہ کے ذریعہ تمام اہل قلم اور فنکار ادب کی بلندیوں کی طرف پیش قدمی کرتے جائیں گے۔ یہ ان کا ترجمان بھی ہوگا اور راہبر بھی۔ جناب پروفیسر سید عبدالمغنی صاحب صدر حلقۂ ادب ریاست بہار نے ادب کی افادیت پر روشنی ڈالی اور رسالہ کے اغراض و مقاصد بیان فرمائے۔

جناب آنند موہن سہائے صدر مجلس نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا کہ ادب بڑا جامع لفظ ہے یہ صرف لٹریچر کا نام نہیں ہے ادب انسان کو انسان بنانے کا نام ہے آپ نے مزید فرمایا میں بے خوف یہ کہتا ہوں کہ اردو زبان کے مقابلہ میں کسی زبان نے اتنی ترقی نہیں کی ہے یہ زبان مشترک تہذیب کی آئینہ دار ہے یہیں پیدا ہوئی اور یہیں پروان چڑھی اس کے تینوں اسکول (دہلی، لکھنؤ، حیدرآباد) اسی ملک میں ہیں تقریباً ساڑھے آٹھ بجے شب سے مشاعرہ کا آغاز ہوا تقریباً بیس شعراء نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ فرمایا۔ (محمد شبیر احمد صابری)

صفحہ ۱۰ سے آگے

اس لیے خود خاں کو چھوڑ کر خدخال کا تکلف غیر ضروری تھا۔ (۲۵) مصرعہ ڈاکٹر صاحب موصوف کی رہنمائی بھی میرے لیے طمانیت بخش ہوگی"۔ اصل لفظ "طمانیت" ہے۔ آغا صاحب جیسے ادیب کو اس کی بگڑی ہوئی شکل "طمانیت" سے اجتناب ضروری تھا خصوصاً ترکیب کی شکل میں۔ ان مذکورہ مقامات کے علاوہ اور بھی جگہ جگہ عبارت میں جھول ہے یا الفاظ کو اس حد تک غیر موزوں انداز میں استعمال کیا گیا ہے کہ فرہنگ میں غرابت پیدا ہو گئی ہے۔ لیکن بہر صورت میں انھیں چند مثالوں تک محدود رکھتا ہوں۔ آخری بات یہ کہ فارسی کے جس مشہور شعر کو آغا صاحب نے اپنے مراسلے کا عنوان قرار دیا ہے اس میں "حدی" کو "حدئی" لکھا گیا ہے جو اگر غلط کاتب نہیں تو نہایت سنگین غلطی ہے۔ (اختر انصاری)

آل احمد سرور

میرا صفحہ

اس مہینے میں اردو کی جو لبنی کتابیں میری ڈاک میں آئیں ان میں ایک بات مشترک تھی۔ ان کی کتابت و طباعت کا معیار خاصا بلند تھا یہ بڑی اچھی بات ہے۔ اب اردو کی کتابیں فخر سے غیر ملکیوں کو دکھائی جا سکتی ہیں۔ کتب خانے کی زینت بن سکتی ہیں۔ آنکھوں پر بار نہیں ہوتیں۔ بظاہر یہ بات بہت اہم نہیں ہے۔ مگر غور سے دیکھا جائے تو ہماری زندگی میں اس جمالیاتی پہلو کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ حسن جمیل سے کس کافر کو انکار ہے مگر لباس حریر کی بھی تو کوئی جگہ ہے۔ لباس حریر نے حسن جمیل کا حسن اور نکھار دیا ہے۔ ایک پرانی مثل یاد آ گئی۔ ایک نور آدمی تو سو نور کپڑا۔ کبھی اس مثل کے باقی حصے پر بھی رائے زنی ہوگی۔

کتابوں سے ابتدائی اردو کے کورس کی تین جلدیں ملیں۔ اسے عبد الرحمٰن بارکر نے حسن جہانگیر ہمدانی، خواجہ محمد شفیع دہلوی اور شفیق الرحمان کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ اردو سکھانے کے لیے اس سے اچھی کتاب میری نظر سے نہیں گزری۔ کتاب میک گل یونیورسٹی کناڈا سے شائع ہوئی ہے۔ پہلی دو جلدوں میں پچیس حصوں میں اردو سکھانے کے سبق، لسانی اور صوتیاتی معلومات، قواعد سبھی کچھ ہے تیسری جلد میں اردو انگریزی، انگریزی اردو کا خاصا کارآمد سرمایۂ الفاظ ہے مجھے کتاب پر صرف ایک اعتراض ہے۔ اس میں اردو اور اسلام کے رشتے پر توجہ بہت زیادہ ہے۔ اردو تو ہماری مشترک تہذیب کی یادگار ہے اور اس کی ترقی میں سبھی مذاہب کا حصہ ہے۔ مگر یہ تین جلدیں غیر ملکیوں کو اردو زبان سکھانے والے ہر استاد کے پاس ہونی چاہئیں۔

نئی شاعری پر جب بحث ہوتی تھی تو جذباتی باتیں زیادہ کی جاتی تھیں۔ مثالیں کم دی جاتی تھیں۔ خوشی کی بات ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی اور حامد حسین حامد نے نئے نام شائع کر کے ہم سب کی مشکل آسان کر دی۔ کتاب کا نام بھی خوب ہے اور معیار بھی اور کتابت و طباعت بھی۔ شروع میں شمس الرحمٰن فاروقی نے ترسیل کی ناکامی کا المیہ کے عنوان سے بہت اچھا مقدمہ لکھا ہے۔ انھوں نے ٹھیک کہا ہے کہ آج کے مقابلے میں کل کی شاعری عام زبان سے اور زیادہ دور ہوگی۔ مرے خیال میں گذشتہ دور کی شاعری کی زبان عام زبان سے نسبتہً زیادہ قریب تر نظر آئے گی۔ اس لیے وہ آسان معلوم ہوگی جس طرح ہمارے صاحب رشید کے لیے اقبال کا کلام ناقابل فہم تھا لیکن فیض کا نہیں۔ اسی طرح آج کے ترقی پسند نقادوں کے لیے نئے شاعروں کا کلام ناقابل فہم ہے لیکن اقبال کا نہیں۔ انھوں نے یہ بھی پتے کی بات کہی ہے کہ نئی اور پرانی شاعری میں زیادہ فرق نہیں کیونکہ یہ دونوں شاعری ہیں۔ بنیادی حیثیت سے نئی اور پرانی شاعری کا فرق رویہ (ATTITUDE) کا فرق ہے۔ حامد حسین حامد نے اپنے اصول انتخاب کی وضاحت کی ہے میرے خیال میں مرتبین نے ۱۹۶۰ء کے بعد جانے پہچانے جانے والے شعراء تک اپنے آپ کو محدود کر کے نئی شاعری کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ بہتر ہوتا کہ ابتدا آزادی کے بعد سے کی جاتی اس طرح نئی شاعری کے تمام پہلو بہتر طور پر سامنے آتے۔ انتخاب کے متعلق اختلاف قدرتی ہے شاید انتخاب کی وضع اپنے شعری نظریے کی اتنی شکار نہیں جتنی بعض امرا بیت اظہار حد بندش کی تجدید ہوتے ہیں ان کی نمائندگی ہو جاتی۔ باقر مہدی، ابرار کومل، بشر نواز، حسن فرخ، حسن کمال، راہی، زاہد راز، زبیر رضوی، شاد تمکنت، شہاب جعفری، شہریار، عتیق حنفی، قاضی سلیم، کمار پاشی، محمد علوی، محمود ایاز، مصحف اقبال توصیفی، ندا فاضلی، وحید اختر، وزیر آغا کی نظمیں اپنی طرف فوراً متوجہ کرتی ہیں اور ان سے ہم ان کی شاعری کے متعلق بہت کچھ جان سکتے ہیں بشرطیکہ ہم ان کے دروازے پہ دستک دیں۔ دستک کے بغیر کوئی بند دروازہ کسی پر نہیں کھلتا۔ یہ اور بات ہے کہ ہم دروازہ بند دیکھ کر ہی لوٹ جائیں۔ بہرحال نئے نام کا مطالعہ ہر لحاظ سے سودمند ہوگا۔ اس میں نئی شاعری کی نمائش نہیں ہے بلکہ یہ نئی چیزیں ... نئی شاعری کے نمونے ہیں۔

نئے نام کے چند روز بعد ہی خوش علیان کا تیسرا مجموعہ کلام شہر ارژنگ ملا تو معلوم ہوا کہ دونوں کتابیں ایک ہی سال میں شائع ہوئی ہیں مگر ان میں کئی صدیوں کا فرق ہے خوش کی شاعری فہم و دوال ... نظر جان اور فہم کی اس کے جانے پہچانے دائروں میں گھومتی ہے۔ خوش کے مجموعے کو پڑھتے وقت ہم ان سے یہ مطالبہ نہیں کریں گے کہ وہ نئے شاعر کہہ دیں میں ہم یہ دیکھیں گے کہ ان کا اپنا رنگ کیا ہے۔ اس میں جو کچھ ہے وہ نئیں ہے پانیں ہیں اور کافری دونوں میں جان ہے یا نہیں۔ کچی بات یہ ہے کہ ہمیں انھیں ذہب نہیں دیتی اور کافری کو انھوں نے زیادہ منھ نہیں لگایا۔ مذہب عشق اختیار کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ ان کے یہاں اس شاعری کی جذبہ زدہ ملتی ہے مگر جذبہ پر زور زیادہ ہے۔ غزلوں کے اشعار جا بجا اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔

قاضی عبد الستار کی ادبی شخصیت اردو کے ادبی حلقوں سے خراج تحسین وصول کر چکی ہے۔ اب ان کا ایک اور ناولٹ ملا اور آخری خط کے نام سے شائع ہوا ہے۔ قاضی کے یہاں سب سے قابل قدر اودھ کی دھرتی کی خوشبو ہے۔ فضا اور وہاں کے زوال آمادہ مگر وضعدار اور جیالے کرداروں کی عکاسی ہے۔ انھوں نے اردو میں علاقائی ناول کی شمع روشن کی ہے۔ یہاں ہیرو اور ہیروئن اشخاص نہیں وہ سرزمین ہے جو افسانے کھینچتی ہے۔ یہ افسانے دل میں نشتر کی طرح اتر جاتے ہیں۔ وقت بڑا بے رحم ہے مگر فنکار نے کتنے ہی دلوں کی حسرتوں میں جھانک کر ان حسرتوں کو وقت کی دستبرد سے محفوظ کر لیا ہے۔

آغا جانی کشمیری کی خود نوشت سوانح عمری "سحر ہونے تک" پڑھ کر بڑی مسرت ہوئی۔ یہ حضرت تھانے مشہور فلم ساز بھی اور بڑی چلبلی اور شریر شخصیت کے بھی مالک ہیں۔ سچ کڑوا بھی تھا اور پھیکا بھی۔ مگر سچ مزیدار اسی وقت ہوتا ہے جب لکھنے والے میں اخلاقی جرأت ہو۔ "سحر ہونے تک" ایک کھلنڈرے کی کہانی ہے۔ اس میں گہرائی ڈھونڈھنا غلط ہوگا۔ مگر جو آدمی اپنے اوپر ہنس سکے اور اپنی کمزوریوں کو بیان کرنے میں نہ شرمائے اسے دوسروں پر ہنسنے اور ان کی کمزوریوں کی طرف اشارہ کرنے کا حق ہو جاتا ہے۔ آغا جانی نے علوم میں فضیلت حاصل نہ کی ہو مگر زندگی کی کتاب کو شوق سے پڑھا ہے۔ لوگوں کی نفسیات کو سمجھا ہے اور آدمی کو ہر رنگ میں دیکھا ہے۔ دیکھنے اور سمجھنے میں اسی طرح دوسروں کو دکھانا ہر ایک کو نہیں آتا۔ آغا جانی کے سجائے ہوئے نگار خانے سے ہم اس لیے متاثر اور محظوظ ہوتے ہیں کہ انھیں رنگوں اور لکیروں کا ہم مشفق یا علم بے بغیر کھیرنا آتا ہے۔

مالک انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ پرنٹر سیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ سے چھپوایا اور پبلشر نذیر حسین نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے شائع کیا۔